اسلامی ریاست

اسلامی معاشرہ اور اسلامی قومیت کے عوامل

آج سے سات سال قبل "ترجمان" (ذی الحجہ ۱۳۶۶ھ) میں "اسلامی ریاست" کے مختلف مباحث کی اشاعت کا آغاز ہوا تھا۔ اس وقت تک اس سلسلۂ مباحث کے چار اجزا "ترجمان" میں اور الگ کتابی شکل میں بھی چھپ چکے ہیں۔ بیچ میں یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے لیے رُک گیا تھا۔ اب مولانا اصلاحی صاحب نے اسے دوبارہ شروع کیا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ اس کی تکمیل کے اسباب فراہم کرے۔ وبیدہ التوفیق

علمائے سیاست، ریاست کا تدریجی ارتقاء اس طرح بیان کرتے ہیں کہ خاندانوں کے اجتماع سے معاشرہ وجود میں آتا ہے، معاشرہ اپنے ایک خاص دور میں قومیت کا رُوپ دھارن کرتا ہے اور جب قومیت اپنے سیاسی شعور کے لحاظ سے اس قدر ترقی کر جاتی ہے کہ اس کے تمام افراد ایک بالاتر اقتدار کی اطاعت کرنے لگتے ہیں تو ریاست وجود میں آجاتی ہے۔

اس تدریج کی روشنی میں ریاست کے اوصاف اور اس کی خصوصیات پر غور کرنے سے پہلے خود معاشرہ اور قومیت کی حقیقت اور ان کے اوصاف و خصوصیات کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے کہ قومیت کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں، کن چیزوں سے اس کے مختلف اجزاء میں اشتراک و اتحاد پیدا ہوتا ہے، وہ کیا محرکات ہیں جو ان میں باہم ربط و اتصال کا جذبہ پیدا کرتے اور ایک دوسرے کے لیے قربانی اور ایثار پر اُبھارتے ہیں تو اس سے خود ریاست کی حقیقت اور اس کے اجزائے ترکیبی میں اتصال و اشتراک کی نوعیت اچھی طرح سمجھ میں آسکے گی۔ قومیت اور ریاست میں وہی نسبت ہے جو نسبت بنیاد اور عمارت میں ہے۔ اگر بنیاد کا پورا نقشہ واضح ہو تو اصل عمارت کی

نوعیت سمجھ لینے میں کوئی زحمت پیش نہیں آئے گی۔ بالخصوص عمارت کے استحکام کے نقطۂ نظر سے اگر اس کا جائزہ لینا ہو تو پھر دیکھنے اور سمجھنے کی اصلی چیز بنیاد ہی ہے نہ کہ عمارت۔ اس وجہ سے پہلے ہم یہ بتائیں گے کہ قومیت کن عوامل کے اشتراک سے پیدا ہوتی ہے، ضعف اور قوت کے لحاظ سے ان کے کیا درجے ہیں، ان عوامل سے متعلق جدید اور قدیم نظریات میں کیا اختلاف ہے۔ پھر اس امر پر غور کریں گے کہ ایک عام قومیت اور ایک اسلامی قومیت میں کیا فرق ہے اور ان دونوں سے پیدا ہونے والی ریاستوں کے مزاج اور ان کے اطوار پر اس فرق کے کیا اثرات مترتب ہوتے ہیں؟

قومیت کے عوامل قومیت چند چیزوں کے اشتراک سے وجود میں آتی ہے۔ نسل، زبان، جغرافی یک جائی، روایات اور مذہب

انسانوں کے کسی گروہ میں اگر یہ چیزیں مشترک ہوں اور اس کے افراد میں ان کے اشتراک کا شعور بھی زندہ ہو تو قدرتی طور پر وہ ایک دوسرے کی ہمدردی و حمایت کرتے ہیں، ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کو سمجھتے ہیں، رنج و راحت اور دکھ سکھ میں اپنے کو ایک دوسرے کا شریک خیال کرتے ہیں اور زندگی کے مسایل پر ایک ہی طرز پر سوچتے ہیں۔

نسل کا اشتراک حمایت و حمیت کا سب سے بڑا محرک ہے، زبان کا اشتراک ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے میں سب سے بڑا معاون ہے، جغرافی یک جائی دوسروں کے مقابل میں اپنے تحفظ اور مدافعت کا احساس پیدا کرنے کے لیے سب سے زیادہ موثر عامل ہے اور تہذیب و روایات کا اشتراک طرزِ فکر میں ہم آہنگی و ہم رنگی پیدا کرنے کے لیے سب سے زیادہ کارگر ہے۔ جہاں اشتراک کے یہ تمام عوامل موجود ہوں وہاں اتحاد و ارتباط کا جذبہ اور حمیت و حمایت کا ولولہ پایا جانا ایک بالکل فطری چیز ہے۔ یہ جذبہ ارتباط و اتحاد پیدا کرنے کے علاوہ دوسروں کے مقابل میں اپنے ایک علیحدہ تشخص کا احساس اور تفوق و بالاتری کا شعور بھی ابھارتا ہے، یہاں تک کہ جن لوگوں کے اندر اشتراک کے یہ سارے پہلو جمع ہو جاتے ہیں ان کے اندر نہایت پُرزور خواہش اس بات کی بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ ہمارے سارے معاملات ہمارے اپنے ہاتھ میں ہوں، اپنے امر و نہی کے مالک ہم خود ہوں، کسی غیر کو یہ حق حاصل نہ ہو کہ

وہ ہمارے معاملات میں کسی قسم کی دخل اندازی کر سکے۔

اس اشتراک کے لیے یہ لازم نہیں ہے کہ جہاں یہ پایا جائے وہاں سرے سے کوئی اختلاف یا تصادم واقع ہی نہ ہو۔ شخصی اور خاندانی اغراض و مصالح میں برابر ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے لیکن ایک بالاتر اقتدار اس طرح کی ساری آویزشوں کو رفع کرتا رہتا ہے اور لوگ اس کے فیصلوں کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ اور یہ سرِ تسلیم خم کرنا صرف اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ ایک قاہر اقتدار کے آگے کسی کے لیے دم مارنے کی گنجائش نہیں ہوتی ہے بلکہ اس میں بڑا دخل اس شعور کو بھی ہوتا ہے کہ قومیت کے بڑے فوائد سے متمتع ہوتے رہنے کے لیے ناگزیر ہے کہ قومیت کا ہر جزو کسر و انکسار کے اصول پر اپنے بعض چھوٹے فوائد کو قربان کرنے کے لیے تیار رہے۔ اگر ہر شخص اپنے چھوٹے چھوٹے مفادات کی قربانی پر راضی نہ ہوگا تو بالآخر اسے بڑے بڑے مفادات سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ یہ شعور ایک خالص سیاسی شعور ہے اور درحقیقت یہی شعور ہے جو کسی قومیت کو ایک حقیقی وجود سیاسی کی حیثیت بخشتا ہے۔

قومیت کا نیا نظریہ | دنیا میں ابتدا سے قومیت کے مذکورہ عوامل ہی اصلی عوامل کی حیثیت سے مسلّم رہے ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ عوامل بالکل فطری اور قدرتی ہیں لیکن سائنس کی ترقیوں نے ان عوامل میں سے اکثر کو شہر بدر کر کے اب ساری اہمیت صرف جغرافی حدود یا دوسرے الفاظ میں وطن کو دے دی ہے۔ وطن کو ایک اہم عامل کی حیثیت تو پہلے بھی حاصل تھی لیکن اب اصلی عامل یہی ہے۔ اگر اس عامل کے ساتھ دوسرے عوامل بھی موجود ہوں تو بہتر لیکن اگر یہ موجود ہے اور دوسرے عوامل موجود نہیں ہیں تو اسی کو اصل قرار دے کر دوسرے عوامل اب اسی سے مصنوعی طور پر پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

وطن کے ایک فطری عامل قومیت ہونے سے تو جیسا کہ عرض کیا گیا انکار کی گنجائش نہیں ہے لیکن جس نوعیت سے اب اس کی اہمیت تسلیم کی گئی ہے وہ فطرت کے تقاضے سے زیادہ ضرورت کی ایجاد ہے۔ سائنس کی ترقیوں نے اب قوموں میں تحفظ اور مدافعت کے احساس کو دوسرے تمام احساسات پر غالب کر دیا ہے اس وجہ سے قومیں اب جغرافی حدود کو بہت زیادہ اہمیت دینے لگی ہیں۔ اب نسل، زبان اور روایات کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی جتنی اہمیت دریاؤں، سمندروں، پہاڑوں اور دوسرے

قدرتی دفاعی حصارات کو دی جاتی ہے۔ پہلے قومیتیں عموماً زمین کے اتنے ہی خطہ پر قناعت کرتی تھیں جتنے کو وہ اپنی نسل اور اپنی تہذیب اور روایات کا گہوارہ سمجھتی تھیں، اس دائرے سے آگے بڑھنے کی خواہش صرف وہی قومیتیں کرتی تھیں جو غیر معمولی طور پر حوصلہ مند ہوتی تھیں اور دوسروں کو اپنا محکوم بنانا چاہتی تھیں۔ لیکن اب ہر قومیت اپنے وطن کے حدود، اقتصادی اور دفاعی نقطۂ نظر سے معین کرتی ہے اور اس پورے دائرے پر بہرحال قابض رہنا چاہتی ہے اگرچہ خود اس کا اپنا وجود اس کے وطن کی قبا سے چھوٹا ہو۔ وہ بجائے اس کے کہ اپنی قامت کے لحاظ سے اپنی قبا بنائے، کوشش یہ کرتی ہے کہ کھینچ تان کر کسی طرح اپنے وجود کو اس قبا کے مناسب بنالے۔ اپنے آپ کو مصنوعی طور پر بڑھانے کا واحد طریقہ جو وہ اختیار کر سکتی ہے یہی ہے کہ اپنے وطن کے جو حدود اس نے قرار دے لیے ہیں اس کے اندر جو دوسری قومیتیں ہیں ان کو اپنے اندر ضم کرنے کی کوشش کرے۔ ان کے اندر خود ان کی نسل، خود ان کی زبان، اور خود ان کے مذہب یا روایات کے لیے جو احساسات پائے جاتے ہیں ان کو دبائے اور ایک وطنی قومیت کے نظریہ کے تحت خود اپنی زبان، اپنے مذہب، اپنی روایات اور اپنے اشخاص و رجال کے عزت و احترام کو ان کے ذہنوں پر مسلط کرے تاکہ وہ ظاہر و باطن دونوں میں غالب قومیت کے ہم رنگ ہو جائیں۔

مذکورہ عوامل کے نقائص مذکورہ عوامل کے عوامل قومیت ہونے سے تو جیسا کہ عرض کیا گیا، انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن مجرد ان عوامل سے جو قومیت وجود میں آتی ہے اس کے مزاج میں چند خرابیاں لازماً موجود ہوتی ہیں۔

پہلی خرابی تو یہ ہے کہ اس طرح کی قومیت نہایت تنگ نظر ہوتی ہے۔ ہر معاملہ میں اس کے زاویۂ نگاہ پر نسلی اور قومی رنگ غالب ہوتا ہے۔ اس کی ساری توجہ کا مرکز پوری نسل انسانی میں سے صرف ایک محدود حصہ ہوتا ہے اور اسی کو وہ پوری انسانیت سمجھتی ہے۔ اس کے لیے یہ بالکل ناممکن ہوتا ہے کہ وہ کبھی تمام انسانوں کے معاملہ پر اس نقطۂ نگاہ سے غور کر سکے کہ یہ سب ایک ہی آدم و حوا کی اولاد، ایک ہی جسم کے اعضاء و جوارح، ایک ہی خاندان کے افراد اور ایک ہی برادری کے اجزاء و ارکان ہیں۔

ایک قلیل حصہ کے سوا ساری دنیا کے ساتھ اس کے تعلقات ہمدردانہ و مشفقانہ ہونے کے بجائے یا تو رقیبانہ و حاسدانہ ہوتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ مصلحت پرستانہ۔ یہ اپنے سوا سب کی بدخواہ اور دشمن ہوتی ہے اور یہ بدخواہی و دشمنی اس کے دایرے میں عیب کے بجائے ہنر سمجھی جاتی ہے اور اس کو قوم پرستی کے معزز لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

دوسری خرابی اس کے اندر یہ ہے کہ یہ نہایت گہرے نسلی تعصب کی مریض ہوتی ہے۔ یہ تعصب اس کے دایرے میں مرض کے بجائے صحت و قوت کی علامت خیال کیا جاتا ہے۔ اس تعصب ہی کو وہ اپنے استحکام کا ذریعہ سمجھتی ہے اس وجہ سے قومیت کے تمام اجزا کے اندر اس جذبے کا برابر بھڑکتے رہنا عین مطلوب ہوتا ہے۔ اس آگ کو بھڑکائے رکھنے کے لیے اس کی ماضی کی روایات کے اندر سے بھی ایندھن فراہم کیا جاتا ہے اور اس کے مستقبل کے حوصلوں سے بھی اس کو ہوا دی جاتی ہے اور جو لوگ زیادہ سے زیادہ مقدار میں یہ اسبابِ اشتعال فراہم کرتے ہیں وہی قوم کے اصلی خیرخواہ اور حقیقی ہیرو سمجھے جاتے ہیں۔ اس آگ کو مشتعل رکھنے کے لیے اگر مزید ایندھن کی ضرورت ہوتی ہے تو عدل و انصاف، رحم و ہمدردی، انسانیت اور رواداری کے معروف اقدار بھی اس میں جھونک دیے جاتے ہیں اور معاملہ اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ "میری قوم، خواہ حق پر ہو یا باطل پر"۔ اس حد پر پہنچ جانے کے بعد یہ قومیت ہی حق و باطل کی کسوٹی بن جاتی ہے۔ جو چیز اس کے حق میں جاتی ہے وہ تو حق بن جاتی ہے اور جو اس کے مفاد کے خلاف پڑتی ہے وہ باطل بن جاتی ہے۔ بڑا سے بڑا جھوٹ، بڑا سے بڑا ظلم اور بڑا سے بڑا فساد نیکی اور انصاف بن جاتا ہے اگر یہ کسوٹی اس کو نیکی اور انصاف قرار دیتی ہی اور واضح سے واضح سچائی اور قطعی سے قطعی انصاف کی بات بھی غداری اور بغاوت ٹھیرا دی جاتی ہے اگر یہ کسوٹی اس کو غداری اور بغاوت ٹھیرا دے۔ اس طرح کی قومیت کے دایرے کے اندر اس کا کوئی امکان نہیں ہوتا کہ کوئی شخص اس کسوٹی سے بالاتر کسی اور معیار حق و باطل کو سامنے رکھ کر کوئی بات کہہ سکے یا کوئی کام کر سکے۔ اگر وہ ایسی جرأت کرے تو عجب نہیں کہ اس کو پھانسی کی سزا ملے اگرچہ وہ سقراط ہی کے درجہ ہی کا آدمی کیوں نہ ہو۔

اس میں تیسری خرابی یہ ہے کہ یہ از خود پھیلنے اور دوسروں کو قائل کرکے ان کو جیت لینے کی فطری صلاحیت سے بالکل محروم ہوتی ہے۔ اس کے لیے دو ہی صورتیں ممکن ہوتی ہیں۔ یا تو وہ اپنے خول کے اندر سمٹی سمٹائی پڑی رہے یا پھر جارحانہ عزم اور فاتحانہ حوصلہ کے ساتھ اٹھے اور جن پر اس کا زور چلے ان کو زیرنگیں کرلے۔ ان دو صورتوں کے سوا اس کے لیے کوئی تیسری راہ نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے یہ یا تو دوسروں سے مار کھا جاتی ہے اگر اس کا مزاج منفعل اور شرمیلا ہوتا ہے یا دوسروں سے لڑتی بھڑتی رہتی ہے اگر اس کا مزاج جارحانہ ہوتا ہے۔ اس کے پاس دلوں کو جیتنے اور عقلوں کو قائل کرنے کے لیے کوئی چیز بھی نہیں ہوتی کہ جو لوگ اس کے دائرے سے باہر ہیں وہ اس کی منطق اور حجت سے مفتوح ہوسکیں۔ یہ طاقت صرف نظریات اور اصولوں میں ہوتی ہے کہ اگر وہ عقل و فطرت پر مبنی ہوں تو وہ دلوں کو مسخر کرلیتے ہیں اور لوگ ان .... کے قائل ہوکر خود ان کے علم بردار اور ان کے پیش کرنے والوں کے ساتھی بن جاتے ہیں۔ لیکن نسل اور نسب سے بنی ہوئی قومیت کے اندر آخر دوسری نسل والوں کے لیے کون سی کشش ہوسکتی ہے؟ دوسروں کے اندر اس کے لیے اگر کوئی چیز ہوسکتی ہے تو تعصب کے جواب میں تعصب، احساس برتری کے جواب میں احساس برتری اور نفرت کے مقابل میں نفرت ہی ہوسکتی ہے۔ اصول اگر عقل و فطرت پر مبنی ہوں تو ساری دنیا پر چھا سکتے ہیں اور تمام نسلِ انسانی، رنگ و خون اور زبان و تہذیب کے سارے اختلافات کے علی الرغم ان کے لیے اپنے دلوں کے دروازے کھول دیتی ہے لیکن کسی خاص نسل کے دعوے داروں کے آگے از خود لوگ کیوں سپر انداز ہوجائیں؟ اپنے اس نقص کے سبب سے کسی نسلی قومیت کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ کسی جہانی ریاست کی بنیاد رکھ سکے۔ اس طرح کی کسی بلند حوصلہ قومیت نے اگر کبھی دنیا پر چھانے کی کوشش کی بھی ہے تو وہ آندھی اور طوفان کی طرح چھائی ہے اور طوفان ہی کی طرح غائب بھی ہوگئی ہے۔ سکندر، نپولین، چنگیز اور تیمور کی فتوحات کی وسعت سے کون انکار کرسکتا ہے لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ ان کا اقدام جتنا تیز تھا اس سے زیادہ تیز ان کی رجعت تھی۔

اس کی چوتھی خرابی یہ ہے کہ نسل کا اشتراک قومیت کے ایک عامل کی حیثیت سے کوئی بہت

زیادہ قوی عامل نہیں ہے۔ یہ تعاون و ہمدردی اور حمیت و حمایت کا محرک اسی حد تک ہوتا ہے جس حد تک کسی نسل کے افراد میں ہم نسلی کی یادداشت تازہ ہو۔ یہ یادداشت چند پشتوں تک تو بلاشبہ باقی رہتی ہے لیکن اس سے آگے جا کر یہ اتنی مضمحل اور بے جان ہو جاتی ہے کہ اس کی حیثیت ایک واہمہ اور خیال سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ اول تو کسی نسل کے متعلق یہ دعویٰ کرنا ہی مشکل ہے کہ وہ اختلاط سے محفوظ ہے، یہ دعویٰ اگر کیا جا سکتا ہے تو زیادہ سے زیادہ ان قبائلی نسلوں ہی کی نسبت کیا جا سکتا ہے جن میں نسل کے تحفظ کا اہتمام بھی ہے اور جو اپنے محدود سیاسی اغراض کے لیے اس نسلی رابطہ کے شعور کو اپنے افراد کے اندر تازہ رکھنے کی بھی کوشش کرتی ہیں، دوسروں کے اندر اس کی حیثیت جیسا کہ عرض کیا گیا ایک واہمہ اور خیال سے زیادہ نہیں ہوتی اس وجہ سے قومیت کے ایک عامل کی حیثیت سے اس کو کچھ ایسی اہمیت نہیں دی جا سکتی اور اس کے بل پر کوئی بہت مضبوط اور وسیع قومیت قائم نہیں ہو سکتی۔

پانچویں خرابی اس کے اندر یہ ہے کہ ان عوامل سے جو قومیت وجود میں آتی ہے اس میں خلطِ غالب چونکہ نسل کا شعور ہی ہوتا ہے، زبان، تہذیب، روایات، ادب اور دوسرے عوامل سب پر اسی کا رنگ غالب ہوتا ہے اس وجہ سے مذہب بھی اگر ان کے ساتھ شامل ہوتا ہے تو وہ بھی انہی کا ایک تابع مہمل بن کر رہ جاتا ہے۔ وہ بھی نسلی قومیت کی مذکورہ خرابیوں کی کوئی اصلاح کرنے کے بجائے ان میں کچھ اضافہ ہی کر دیتا ہے۔ ہماری مراد یہاں صرف انہی مذاہب سے نہیں ہے جو مشرکانہ عقائد کے تحت انسانوں نے خود ایجاد کیے ہیں، یہ مذاہب تو ہوتے ہی قومی اور نسلی ہیں، بلکہ ہمارا کہنا یہ ہے کہ ایک صحیح مذہب بھی نسلی عصبیت کے زیرِ سایہ ایک نسلی مذہب بن کے رہ جاتا ہے اور اپنی تمام عقلی اور فطری خوبیاں آہستہ آہستہ کھو بیٹھتا ہے۔ اس کی سب سے زیادہ واضح مثال یہود کا مذہب ہے۔ بنی اسرائیل نے چونکہ کبھی اپنی نسلی قومیت کے خول سے باہر جھانکنے کی کوشش نہیں کی اس وجہ سے انہوں نے اپنے مذہب کو بھی، جو اصلاً ایک خدائی مذہب تھا تراش خراش کر اپنی قومیت ہی کے سانچے میں ڈھال لیا۔ توریت میں یہ جو بار بار آتا ہے کہ "خداوند خدا اسرائیل کا خدا" اور "اے اسرائیل تو

خدا کا پہلو ٹھا ہے۔" یہ سب اسی عصبیت نسلی کی پیدا کردہ تعبیریں ہیں۔ انہوں نے مذہب سے روشنی لینے اور اور اس روشنی سے اپنی نسلی عصبیت کی تنگ نظری دور کرنے کے بجائے اپنے مذہب کو بھی اپنی ہی طرح تنگ نظر اور متعصب بنا ڈالا اور یہ مذہب بجائے اس کے کہ ان خرابیوں کے دور کرنے میں کچھ معین ہوتا جو نسل و نسب سے بنی ہوئی قومیت کے اندر مضمر ہیں الٹا ان خرابیوں کو بھلائیاں ثابت کرنے میں ان کا ایک غیبی مددگار بن گیا۔

اس میں چھٹی خرابی یہ ہے کہ اس قومیت کے مطالبات اور فطرتِ سلیم اور عقلِ سلیم کے مقتضیات ایک خاص دایرہ ہی تک ہم آہنگ رہ سکتے ہیں۔ اس خاص دایرے سے آگے بڑھ کر عموماً ان کو ہم آہنگ رکھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس دایرے سے آگے قومیت کے تقاضے صریحاً انسانیت کے وسیع مفادات، اخلاق کے معروف مسلمات اور انصاف کے ہمہ گیر اصولوں سے متصادم ہوتے ہیں۔ قومیت کے علم بردار اس تصادم کو دور کرنے کے لیے قومیت کے مفاسد کا اعتراف کرنے کے بجائے کوشش اس بات کی کرتے ہیں کہ قومیت ہی کی اساس پر انسانیت، اخلاق اور انصاف کا ایک بالکل ہی نرالا فلسفہ تیار کر دیں۔ یہ فلسفہ تیار تو ہو جاتا ہے، پڑھے لکھے ذہین لوگ اگر آمادہ ہو جائیں تو کیا نہیں کر سکتے، لیکن یہ فلسفہ سلیم الفطرت انسانوں کو کبھی اپیل نہیں کرتا۔ اس کے لیے مثال کے طور پر سولھویں صدی کے سیاسی فلسفی میکاولی کی تحریریں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اس طرح کے فلسفے اہل سیاست کی امنگیں پوری کرنے کا وقتی طور پر ایک ذریعہ تو ضرور بن جاتے ہیں لیکن انسان چونکہ ایک نسلی حیوان ہی نہیں بلکہ اپنی ایک عقلی و اخلاقی ہستی بھی رکھتا ہے اور اس کا یہ پہلو اس کے تمام دوسرے پہلوؤں پر غالب ہے اس وجہ سے اندر سے طبیعتیں ان سے برابر ابا کرتی رہتی ہیں اور جس چیز پر کسی معاشرہ کے معقولیت پسند لوگ مطمئن نہ ہوں اس کے بودے پن کو کتنے دنوں تک چھپایا جا سکتا ہے؟

وطنی قومیت کے مفاسد وطنی قومیت کے اندر مذکورہ بالا مفاسد کے علاوہ کچھ مزید مفاسد بھی ہیں جن کی طرف ہم یہاں اشارہ کرنا چاہتے ہیں لیکن اصل بحث سے پہلے اس حقیقت کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ وطن کا ایک عامل وطنیت ہونا ایک علٰحدہ چیز ہے اور وطن کو اساس بنا کر مختلف قومیتوں سے ایک متحدہ

قومیت کا کنبہ جوڑنا ایک علحدہ شے ہے۔ جہاں تک پہلی چیز کا تعلق ہے وہ بالکل مقتضائے فطرت ہے۔ جس طرح ہر شخص کو اس کا گھر عزیز ہوتا ہے، اس کے کونے کونے اور گوشے گوشے سے اس کی روایات وابستہ ہوجاتی ہیں، اس کی حفاظت اور اس کے اوپر اپنا حق قائم رکھنے کے لیے وہ بسا اوقات اپنا مال اور اپنی جان سب کچھ قربان کر دیتا ہے اور ایسا کر گذرنا ہر حق پسند کے نزدیک ایک مستحسن اور غیرت مندانہ کام سمجھا جاتا ہے۔ اُسی طرح ہر قومیت کو اس کا وطن عزیز و محبوب ہوتا ہے۔ وہ اس کو اپنی جنم بھومی اور مادر وطن سمجھتی ہے، اس کو اپنی تہذیب اور اپنے تمدن کا گہوارہ خیال کرتی ہے، اس کے چپہ چپہ پر اس کے اسلاف کی عظمت اور اس کے آبار واجداد کے کارناموں کی تاریخ ثبت ہوتی ہے، اس کے دریا اور پہاڑ اور اس کے نشیب و فراز سب کی زبانوں پر اس کی روائتیں اور حکایتیں ہوتی ہیں، اس کے پہاڑوں میں اس کی زندگی کے سرچشمے، اس کے کھیتوں اور باغوں میں اس کی معاش و معیشت کے ذخیرے اور اس کی وادیوں اور اس کے کہساروں میں اس کی خوشیاں اور اس کی بہاریں ہوتی ہیں اس وجہ سے ہر قوم اپنے وطن کو اپنی مشترک دولت سمجھتی ہے اور یہ اشتراک اس کے اندر ہم وطنی کا جذبہ پیدا کرتا ہے جو ان کو وطن سے مشترک استفادہ اور اس کی مشترک حفاظت وصیانت کے لیے برابر جوڑے رکھتا ہے۔ یہ چیز عین تقاضائے فطرت ہے۔ نہ یہ عقل کے خلاف ہے اور نہ مذہب واخلاق کے۔ لیکن دوسری چیز یعنی وطن کو اساس قرار دے کر مختلف قومیتوں کو ایک متحدہ قومیت میں جوڑ ڈالنا ایک بالکل مختلف چیز ہے جس کی خرابیاں بالکل واضح ہیں۔

وطن کی بنیاد پر مختلف قومیتوں سے ایک متحدہ قومیت جو بنتی ہے اس میں اصلی مطمح نظر تو یہ ہوتا ہے کہ ایک وطن میں رہنے بسنے والی ایک سے زیادہ قومیتیں وطن کے سوا دوسرے عوامل قومیت —— نسل، زبان، کلچر، روایات اور مذہب —— کو جو ان کے اندر اپنے الگ الگ تشخص اور اپنی مخصوص انفرادیت کا احساس پیدا کرتے ہیں ختم کردیں اور ان کی جگہ ایک مخلوط نسل، ایک مشترک زبان، ایک مشترک ثقافت اور ایک مشترک مذہب پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن یہ بات کہنے میں بھی بڑی بھونڈی معلوم ہوتی ہے اور عملاً بھی بہت بعید از قیاس نظر آتی ہے اس وجہ سے کہی یوں جاتی ہے کہ مختلف قومیتیں

الگ الگ تشخصات کو اگر محفوظ رکھنا چاہیں تو اپنے الگ دایروں کے اندر محفوظ رکھیں لیکن اجتماعی و سیاسی دایرے میں ایک ہی قوم کی حیثیت سے نمایاں ہوں اور اپنے انفرادیت پسندانہ رجحانات و عوامل کو اس میں مُخل نہ ہونے دیں۔ اٹھارویں صدی سے پہلے پہلے تو عملاً یہی صورت تھی کہ غالب اور فتحمند قومیت مغلوب قومیت کے ان تمام تشخصات کو تقریباً ختم کر دیتی تھی جو اس کے انا کو زندہ رکھنے والے خیال کیے جاتے تھے لیکن اٹھارویں صدی میں نپولین کی فتوحات اور اس کے بعد پہلی جنگِ عظیم نے مختلف اسباب سے جن کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی، قومیتوں کے اندر اپنے امتیازی تشخصات کو زندہ اور باقی رکھنے کا احساس اتنا قوی کر دیا کہ غالب قومیتوں کے لیے ان سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں رہا۔ اب اگرچہ ایک نظریہ کی حیثیت سے یہ مسلّم ہے کہ ہر قومیت کو اپنی ہستی، اپنی زبان، اپنی تہذیب اور اپنے مذہب کو باقی رکھنے کا حق ہے اور یہ بات بظاہر نہایت اچھی بھی معلوم ہوتی ہے لیکن اس کا سارا حسن صرف کاغذ کے صفحات ہی پر ہے، عمل میں آکر اس کی یہ ظاہری چمک دمک بالکل ہی ختم ہو جاتی ہے اور اس کی تمام اندرونی خرابیاں ابھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ ہم یہاں اس کی بعض نمایاں خرابیوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

اس کی پہلی خرابی تو یہ ہے کہ یہ قومیت متضاد عناصر کا ایک مجموعہ ہوتی ہے۔ بظاہر تو یہ عناصر ایک ہی بندھن میں باندھ دیے جاتے ہیں لیکن بباطن ان کی امنگیں اور ان کے حوصلے ایک دوسرے سے بالکل مختلف رہتے ہیں۔ جہاں نسل، زبان، تہذیب، ادب اور مذہب کے اتنے اختلافات موجود ہوں وہاں صرف ہم وطنی کا رشتہ ان کو باہم جوڑے رکھنے میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوتا۔ ان کے درمیان اختلاف اور نزاع کے جو محرکات موجود ہوتے ہیں وہ برابر اپنا عمل کرتے رہتے ہیں اور کبھی ان کو ایک قوم کی طرح پوری یک جہتی کے ساتھ کسی قومی نصب العین کے لیے کام نہیں کرنے دیتے۔ یہ قومیت کامیاب صرف اسی صورت میں ہوتی ہے جب تضاد کے یہ اسباب یا تو سطحی ہوں، یا پوری طرح دبا دیے گئے ہوں، یا دوسرے عناصر کمیت و کیفیت کے اعتبار سے اتنے ناقابلِ لحاظ ہوں کہ غالب عصبیت کے مقابل میں وہ کان دبائے پڑے رہنے پر مجبور اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہنے ہی میں اپنی سلامتی سمجھتے ہوں۔

اس کی دوسری خرابی یہ ہے کہ اس قومیت کی تشکیل کرنے والے مختلف اجزا مجبور ہوتے ہیں کہ ان کے پاس جو قیمتی ورثہ خود ان کی قومی روایات، قومی ادب، اور اپنے آبائی دین کا ہے اس کو تو اجتماعی و سیاسی زندگی سے خارج کر کے سڑنے اور گلنے کے لیے چھوڑ دیں اور اس کی جگہ پر ہر چیز ایک مصنوعی شکل میں قبول کرنے پر راضی ہوں۔ یہ قربانی صرف انہی عناصر کو نہیں کرنی پڑتی ہے جو عددی اعتبار سے اقلیت میں ہوتے ہیں بلکہ بسا اوقات اپنے دوسرے ساتھی یا ساتھیوں کو مطمئن کرنے کے لیے شریکِ غالب کو بھی یہ قربانی کرنی پڑتی ہے۔ ادب میں رجحانات بدلتے ہیں، زبان کا ڈھانچہ متغیر ہوتا ہے، روایات کا ایک نیا ملغوبہ تیار ہوتا ہے، رسوم میں بالکل بے گانہ آمیزشیں ہوتی ہیں، تاریخ ایک نیا قالب اختیار کرتی ہے، جو عدو سمجھے جاتے تھے وہ ہیرو بنتے ہیں، جو ہیرو خیال کیے جاتے تھے بسا اوقات ان کے نام کتابوں کے صفحات اور ذہنوں کی الواح سے کھرچ کھرچ کر نکالے جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ مصیبت اس وطنی قومیت کے ہاتھوں مذہب پر آتی ہے۔ مذہب ایک قوی ترین عامل قومیت ہے اور سطحی مفادات کے آگے مشکل ہی سے سرِ تسلیم خم کرتا ہے۔ اس وجہ سے قومیت کی تشکیل میں اس کو سب سے بڑا مانع قرار دے کر اس کا علاج یہ سوچا گیا ہے کہ اس کو اجتماعی و سیاسی زندگی سے بالکل ہی خارج کر کے مسجد، یا مندر، یا کلیسا کے اندر بند کر دیا جائے۔ اس لادینیت کے بغیر وطنی قومیت کا ڈھانچہ کھڑا ہو ہی نہیں سکتا۔

اس میں تیسری خرابی یہ ہے کہ غالب قومیت کے اندر اگر نسلی اور مذہبی عصبیت پوری طرح جڑ پکڑے ہوئے ہوتی ہے تو وہ وطنی قومیت کا روپ دھارن کر کے بھی دوسرے شریکوں کے مقابل میں اجتماعی سیاسی زندگی کے ہر گوشے میں اپنے مفاد اور اپنے رنگ کو غالب رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ دوسرے اگر اپنے حقوق کا نام لیں، اپنی زبان کا ذکر کریں، اپنی تہذیب کا رونا روئیں، اپنے مذہب کا حوالہ دیں تو اس کو گروہی تعصب، انتشار پسندی اور ملک و وطن کے ساتھ غداری پر محمول کیا جاتا ہے لیکن شریکِ غالب دھڑلے کے ساتھ ساری چیرہ دستیاں کرتا ہے لیکن مجال نہیں ہے کسی کی کہ اس کے خلاف زبان ہلا سکے۔ اس اس صورت حال کی بہترین مثال بھارت کی ہندو اکثریت کا طرزِ عمل ہے۔

اس کی چوتھی خرابی یہ ہے کہ بعض حالات میں شریکِ غالب بھی اس میں شدید نقصان اٹھاتا ہے۔

یہ صورت اس وقت پیش آتی ہے جب شریک غالب عددی اکثریت تو رکھتا ہو لیکن اس کے اندر وحدت اور تنظیم نہ ہو، معاشی اعتبار سے وہ بدحال اور سیاسی اعتبار سے وہ غیر منظم ہو، اس کے لیڈر سادہ لوح یا ابن الوقت ہوں، اس کے اندر محض مفاد اور اغراض کے لیے بہت سی پارٹیاں بن گئی ہوں جس نے اس کی سیاسی طاقت بالکل منتشر ہوگئی ہو اور یہ پارٹیاں محض وقتی مفاد اور حصول اقتدار کے لیے اپنے دشمنوں اور مخالفوں سے سودا بازیاں کرسکتی ہوں۔ ایسی صورت میں عددی اکثریت رکھنے کے باوجود وہ کسی حوصلہ مند اور منظم اقلیت کے ہاتھ میں ایک کھلونا بن کے رہ جاتی ہے۔ یہ اقلیت اپنی ہوشیاری اور سیاسی جوڑ توڑ سے اس کی پارٹیوں کو اپنا آلۂ کار بنا لیتی ہے اور جو مقاصد وہ خود اپنے ہاتھوں پورے کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی وہ ان کے واسطے سے بڑی آسانی سے پورے کر لیتی ہے۔ اس میں بڑی سہولت اس کو اس وقت حاصل ہوسکتی ہے جب اس کو انتخابات میں شریک غالب کے نمائندوں کے انتخابات پر بھی اثر انداز ہونے کا موقع مل جائے۔ اس کی نہایت واضح مثال مشرقی پاکستان میں موجود ہے۔ یہاں مسلمان عددی اکثریت رکھنے کے باوجود اپنی مذکورہ بالا کمزوریوں کے سبب سے ہندوؤں کے لیے ایک چراگاہ بنتے جا رہے ہیں۔ اور اس علاقے میں مخلوط طریقۂ انتخاب رائج ہو جانے کے بعد اقلیت کے اکثریت پر اثر انداز ہونے کے مواقع اس قدر بڑھ جائیں گے کہ اکثریت نہ صرف تہذیب و تمدن اور مذہب کے اعتبار سے سخت نقصان اٹھائے گی بلکہ عجب نہیں کہ ملک کی سالمیت ہی خطرے میں پڑ جائے۔

اس کی پانچویں خرابی اور سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ قومیت خطرات و مشکلات کے مقابل میں عموماً بہت بودی ثابت ہوتی ہے۔ وطنی عصبیت کا جذبہ ابھارنے کے لیے اگر کوئی محرک سب سے زیادہ قوی ہوسکتا ہے تو وہ کسی مشترک مصیبت کا ظہور یا اس کے ظہور کا خطرہ ہی ہوسکتا ہے لیکن یہ مشترک مصیبت بھی ایک وطنی قومیت کے مختلف عناصر میں اتحاد کا عام ولولہ اور حب وطن کا عام جوش صرف اسی صورت میں پیدا کرتی ہے جب قومیت کے تمام اجزا اپنے آپ کو وطن کے تمام ذہنی و مادی فوائد میں برابر کا شریک و سہیم سمجھتے ہوں۔ اگر یہ صورت نہ ہو اور اوپر ہم بیان کرچکے ہیں کہ اس صورت کا پیدا ہونا

صرف خاص حالات ہی میں ممکن ہے) توجو اجزائے قومیت اپنے آپ کو مظلوم سمجھتے ہیں وہ اس مشترک مصیبت کو ایک مصیبت سمجھنے کے بجائے بعض حالات میں اس کو اپنے لیے رحمت سمجھتے ہیں اور ایسے مواقع پر ان کی ہمدردیاں اپنے وطنی ہم قوموں کے بجائے بیرونی حملہ آوروں ہی کے ساتھ ہوتی ہیں۔ بیرونی حملہ آور اگر زیرک ہوں تو وہ کسی ملک کے اس اندرونی اضطراب سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ چنانچہ پہلی جنگ عظیم کے موقع پر اتحادیوں نے جو یہ نعرہ لگایا تھا کہ یہ جنگ مظلوم و مقہور اقلیتوں کی آزادی کے لیے لڑی جارہی ہے اس نعرہ سے انہوں نے اپنے حریفوں کے مقابل میں بڑا فائدہ اٹھایا۔ اگرچہ اس سے فائدہ اٹھا چکنے کے بعد انہوں نے خود اس کی پوری بے حرمتی کی۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ وطن کی اساس پر بنی ہوئی قومیت اپنے اصلی مدعا کے اعتبار سے تو بودی اور پھس پھسی ہوتی ہے البتہ فتنہ کا علم یا اسلامی اصطلاح میں منافقین کی پرورش کے لیے یہ بہترین پناہ گاہ فراہم کرتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر قومیت کے تمام عناصر کو بالکل مساوی درجہ میں آسودہ اور مطمئن کیا جاسکے تو اس خرابی کو دور کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ خرابی خود وطنی قومیت کی تعمیر ہی میں مضمر ہے اس وجہ سے اس کو دور کرنا بہت مشکل ہے۔

اسلام کے نقطۂ نظر سے مذکورہ عوامل پر تنقید

اب آئیے اسلام کی روشنی میں مذکورہ عوامل پر غور کیجیے کہ وہ ان کو کس حد تک اور کس حد تک قبول کرتا ہے۔

اسلام ان تمام عوامل قومیت کو نہ تو یک قلم رد کرتا ہے اور نہ ان کو پورا کا پورا قبول ہی کرتا ہے۔ ان عوامل میں سے جو عامل جس حد تک عقل اور فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہے اس کو اس نے نہ صرف اختیار کرلیا ہے بلکہ اس کو جزو دین بنا دیا ہے جس کو نہ صرف ماننا ضروری ہے بلکہ اس پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ لیکن جہاں کہیں عقل اور فطرت کے حدود سے ان میں کوئی انحراف یا تجاوز ہے اسلام نے واضح الفاظ میں اس کی نشان دہی کردی ہے کہ یہ انحراف یا تجاوز حدود اللہ سے تجاوز ہے اور اس سے معاشرہ اور قومیت میں فساد کو راہ ملتی ہے جس کا اثر بالآخر سارے نظام زندگی پر پڑتا ہے۔

اسلام میں نسل و نسب کا درجہ

اسلام نسل و نسب کے رابطہ کو ایک نہایت قوی رابطہ تسلیم کرتا ہے۔ اس کو خاندان اور معاشرہ کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ رشتۂ رحم کاٹنے کو ایک گناہ عظیم اور فساد فی الارض کا سبب

بتاتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کو تنگ نظریوں اور تعصبات کے شر سے پاک رکھنے کے لیے مندرجہ ذیل حقایق بھی سامنے رکھ دیتا ہے۔

ایک یہ کہ تمام انسان ایک ہی خدا کی مخلوق اور ایک ہی آدم وحوا کی اولاد ہیں اس وجہ سے حقوق اگرچہ الاقرب فالاقرب کے اصول پر قایم ہیں لیکن اپنے خاندان یا اپنی قوم وقبیلہ کو حق وباطل کا معیار نہیں بنا لینا چاہیے اور اس کے تعصب میں اندھے ہو کر انصاف اور سچائی کے بالاتر اصولوں سے منحرف نہیں ہو جانا چاہیے۔

دوسرا یہ کہ خاندانوں اور قبیلوں کی تمیز اور زبان اور رنگ کی تفریق محض شناخت اور تعارف کے لیے ہے یہ نہ عزت اور شرافت کی کوئی کسوٹی ہے اور نہ خدا سے تقرب وتوسل کی کوئی دلیل، خدا کی نظر میں درجہ اور مرتبہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو خدا سے ڈرنے والے اور اس کی شریعت اور اس کے قانون کا احترام کرنے والے ہیں۔ اور یہی لوگ ایک اسلامی معاشرہ میں بھی حقیقی عزت واحترام کے مستحق ہیں۔

تیسرا یہ کہ اجتماعی وسیاسی زندگی کے لیے صرف وہی ضوابط صحیح ہیں جو انسانی فطرت کے مطابق خود انسانوں کے خالق نے بنائے ہیں نہ کہ وہ جو قومی وقبائلی عصبیت کے تحت خود انسانوں نے ایجاد کیے ہیں۔

مذکورہ بالا حقایق قرآن وحدیث میں مختلف اسلوبوں اور طریقوں سے بیان ہوئے ہیں ہم چند آیتوں اور حدیثوں کے ترجمے یہاں درج کرتے ہیں :-

"اے لوگو! اپنے اس خداوند سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا اور اسی سے اس کی بیوی کو بھی پیدا کیا۔ پھر ان دونوں سے بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں پھیلائیں۔ اور اس اللہ سے ڈرو جس کے واسطے سے تم ایک دوسرے سے طالب مدد ہوتے ہو اور رحمی رشتوں کا احترام کرو۔ اللہ تم پر نگہبان ہے۔" (سورۂ نساء آیت)

یہ آیت ان بنیادی اصولوں کو واضح کر رہی ہے جن پر اسلامی معاشرہ (یا بالفاظ دیگر اسلامی قومیت)

قایم ہے۔ اس میں دو چیزوں کو باہمی ہمدردی اور باہمی تعاون و تناصر کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ ایک خدا کو، جو سب کا خالق ہے اور ایک رشتۂ رحم کو، جس کا شعور اگرچہ ایک خاص حد سے آگے جا کر مضمحل ہو جاتا ہے۔ لیکن فی الحقیقت وہ تمام نسلِ انسانی کے درمیان مشترک ہے۔ علاوہ ازیں عورت کو بھی اس معاشرہ میں برابر کا شریک ٹھیرایا گیا ہے اگرچہ اپنے فرائض کے اعتبار سے اس کا دایرہ مردوں کے دایرے سے الگ ہے۔

دوسری آیت کا ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

"اے لوگو! ہم نے تم کو ایک ہی مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور ہم نے تم کو خاندانوں اور قبیلوں میں اس لیے تقسیم کیا ہے کہ یہ چیز تمہارے لیے تعارف کا ذریعہ ہو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ باعزت وہ ہے جو خدا سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔ اللہ علیم و خبیر رکھنے والا ہے"۔ (الحجرات، ۱۳)

حدیث میں رشتۂ رحم کی اہمیت ملاحظہ ہو:۔

"حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے خلق کو پیدا کیا، یہاں تک کہ جب ان کو پیدا کر کے فارغ ہوا تو رحم کھڑا ہوا اور اس نے عرشِ الٰہی کو تھام کر کہا کہ یہ جگہ ہے اُس کی جو قطع رحم سے تیری پناہ چاہے؟ ارشاد باری ہوا ہاں۔ کیا تو اس بات پر راضی نہیں ہے کہ میں اس سے جوڑوں جو تجھ سے جوڑے اور اس سے کاٹوں جو تجھ سے کاٹے؟ بولا، میں اس پر راضی ہوں۔ ارشاد باری ہوا کہ یہ مقام تجھ کو بخشا گیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم چاہو تو قرآن کی یہ آیت پڑھ لو، (یعنی اس آیت سے اس مضمون کی تائید ہو جائے گی) فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ ۝[1] (ریاض الصالحین بحوالہ مسلم و بخاری)

[1] پس تم سے یہی متوقع ہے، اگر تم منہ موڑے رہو، کہ تم زمین میں فساد مچاؤ اور رشتہ رحم کو کاٹو۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور ان کے کان بہرے کر دیے اور ان کی آنکھیں اندھی کر دیں۔ (محمد، ۲۲)

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ قطع رحم یا قطع قرابت اتنا بڑا جرم ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی پاداش میں قطع رحم کرنے والوں پر لعنت کر دیتا ہے اور ان کے دلوں دماغوں کو اندھا بہرا کر دیتا ہے۔

زبان وادب کی حیثیت اسلام معاشرہ کی تشکیل میں زبان وادب کے مرتبہ اور اس کی اجتماعی وسیاسی اہمیت کو بھی تسلیم کرتا ہے لیکن اس کو بھی مجرد قومی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے بجائے اخلاقی معیاروں پر جانچ کر اس کے سلیم وسقیم اور خبیث وطیب میں فرق کرتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ قومی زبان اور قومی ادب کے نام سے رطب ویابس اور پاک وناپاک کا جو انبار بھی اکٹھا کر دیا جائے وہ سب کا سب بلا کسی فرق وامتیاز کے یکساں عزت واحترام کے لائق قرار دے دیا جائے۔ اور اس پودے کی حفاظت وصیانت اور اس سارے کی نقل وروایت ایک قومی فریضہ سمجھ لی جائے۔ حد یہ ہے کہ لاکھوں روپے دیہاتیوں کے گیتوں اور ان کے قصوں کہانیوں کے جمع کرنے، ان کو مرتب کرنے اور پھر ان کو لوگوں کے ذہنوں پر لادنے پر ضایع کر دیے جائیں۔ اسلام کا نقطۂ نظر اس معاملے میں جیسا کہ عرض کیا گیا بالکل عقلی واخلاقی ہے۔ وہ صرف اسی ادب کو ادب قرار دیتا ہے جو صحیح منبع سے نکلا ہو اور جو ذہنوں کو صحیح غذا دینے والا اور طبیعتوں کو صحیح رُخ پر ڈالنے والا ہو۔ اگر محض ادبی اور قومی نقطۂ نگاہ سے اس معاملے کو دیکھا جائے تو حالی واقبال کے ادب اور امانت لکھنوی اور زہرعشق کے مصنف کے ادب دونوں کے لیے احترام کے الگ الگ پہلو نکل سکتے ہیں لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو امانت اور شوق کے ادب کو ادب میں جگہ دینے کے بجائے عیب کی طرح چھپانا پڑے گا۔

امرءالقیس کو عرب میں ایک قومی شاعر ہونے کے لحاظ سے اشعر الشعراء کا بلند مقام حاصل تھا لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے میں فرمایا کہ اشعر الشعراء وقائدھم الی النار کہ یہ تمام شاعروں کا امام اور ان کو جہنم کی طرف لے جانے والا ہے۔ اگر حضورؐ بھی اس کو محض قومی نقطۂ نگاہ سے دیکھتے تو اس کو اشعر الشعراء ہی قرار دیتے لیکن آپؐ کا نقطۂ نگاہ اخلاقی بھی تھا اس وجہ سے آپؐ نے ایک ایسے شاعر کے سارے ذخیرۂ ادبی کو رد کر دیا جس نے عرب کے قومی ادب کو اگرچہ سب سے قیمتی سرمایہ دیا تھا لیکن ساتھ ہی بے حیائی اور فحاشی میں بھی آپ اپنی مثال تھا۔ اس کے برعکس آپؐ نے دوسرے اسلامی

سے شاعروں کے کلام سنے اور ان کی تحسین فرمائی۔ زمانۂ جاہلیت کے بعض شاعروں اور خطیبوں کے کلام کی بھی آپؐ نے تعریف فرمائی۔ بعض خطیبوں کے متعلق تو یہ تک ارشاد ہوا کہ یہ حقیقت کے بہت قریب پہونچ گئے تھے لیکن حقیقت کو پا نہ سکے۔ حضرت عمرؓ مشہور جاہلی شاعر زہیر کے کلام کو بہت پسند کرتے تھے، اور وجہ یہی تھی کہ اس کے کلام میں امرأ القیس کی سی رندی و ہوسناکی نہیں ہے بلکہ نہایت گہری حکمت کی باتیں ہوتی ہیں اور ایسی خوبی کے ساتھ کہتا ہے کہ دل میں اترتی چلی جاتی ہیں۔ یہ باتیں اس امر کا نہایت واضح ثبوت ہیں کہ اسلام میں قومیت کے ایک عامل کی حیثیت سے زبان و ادب کو ایک جگہ حاصل تو ہے لیکن صرف پاکیزہ ادب کو حاصل ہے، ہر ہرزہ سرائی کو اسلام یہ جگہ نہیں دیتا۔

تہذیب اور روایات اسلام قومیت کی تشکیل میں تہذیب اور روایات کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتا ہے لیکن جس طرح وہ زبان و ادب کو اخلاقی کسوٹی پر جانچ کر اس کے صالح عنصر کو اپناتا اور فاسد کو رد کر دیتا ہے اسی طرح وہ قومی تہذیب کے مظاہر اور قومی روایات کو بھی اخلاق کی کسوٹی پر جانچتا ہے اور اس جانچ کے بعد ان کا جو حصہ منکر ثابت ہو جاتا ہے اس کو تو رد کر دیتا ہے اور جو معروف ہوتا ہے اس کو اختیار کر لیتا ہے۔ قرآن کو پڑھیے تو آپ کے سامنے بار بار یہ بات آئے گی کہ فلاں بات معروف کے مطابق کرو۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس معاملے میں قومی دستور اسلام کی نظر میں پسندیدہ تھا جس کے سبب سے اسلام نے اس کی اس قدر عزت بڑھائی کہ اس کو خود اپنا ایک حصہ بنا لیا۔ برعکس اس کے قومی رسوم و عادات یا تہذیب اور روایات میں جو باتیں اخلاق کے اصول کے منافی یا حقیقت کے خلاف تھیں ان کو منکر قرار دے کر رد کر دیا۔ اسی طرح عرب کے تاریخی اشخاص میں سے لقمان اور ان کے فرزند کا نہایت اچھے انداز میں قرآن نے ذکر کیا ہے۔ بلکہ پوری قوم کے بوڑھوں اور نوجوانوں کے سامنے ان کو ایک لائق باپ اور ایک لائق فرزند کی مثال کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ ان کی حکیمانہ نصیحتوں کا رتبہ تو اتنا بڑھایا ہے کہ وحی الٰہی نے ان کو خود قرآن کا ایک حصہ بنا دیا ہے۔ یہ لقمان عرب کے حکماء میں سے صرف ایک حکیم تھے کوئی پیغمبر نہیں تھے۔ ان کے پیغمبر ہونے کا کوئی ثبوت کم از کم میرے علم میں نہیں ہے۔ اسی طرح قرآن نے ذوالقرنین کا ذکر ایک عادل اور خداترس حکمراں کی حیثیت سے کیا ہے حالانکہ وہ ایک غیر قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ ان چیزوں سے ثابت

ہوتا ہے کہ اسلام تہذیب اور روایات کو متعصبانہ نگاہ سے دیکھنے کے بجائے حق پرستانہ نگاہ سے دیکھتا ہے، اس کا خود اپنا ایک معیار ہے جس پر جانچ کر وہ ایک چیز کو رد یا قبول کرتا ہے اور یہ معیار اخلاقی اور عقلی ہے۔ نہ کہ قومی۔ قومی نقطۂ نگاہ تو ان معاملات میں بسا اوقات اتنا متعصبانہ ہو جاتا ہے کہ اس تعصب کے اندھے فرعون کو محض اس دلیل پر اپنا لیڈر مان لیں گے کہ وہ ان کی اپنی قوم سے تھا اگرچہ وہ نہایت مستبد اور ظالم تھا اور اس کے ظلم و استبداد ہی کے سبب سے اس کی پوری قوم عذابِ الٰہی میں گرفتار ہوئی۔ اور حضرت موسیٰ ؑ کو محض اس بنا پر رد کر دیں گے کہ وہ نسلاً دوسری قوم سے تعلق رکھتے تھے اگرچہ وہ عدل و انصاف کے پیکر تھے اور ان کے ہاتھوں مظلوموں کو نجات ملی۔

اسلام کی نظر میں وطن کی حیثیت اسلام وطن کو بھی بڑی اہمیت دیتا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی مسلمان اگر اپنے وطن کی حفاظت کی راہ میں مارا جائے تو اس کی موت شہادت کی موت ہے لیکن وطن کی اس اہمیت کے باوجود اسلام نے وطن کو بھی حق کے اصولوں کے تابع ہی رکھا ہے، اس کو حق سے بالاتر نہیں قرار دیا ہے۔ اسلام کی نظر میں انسان کی اصلی قدر و قیمت اس کے ایک عقلی و اخلاقی ہستی ہونے کی ہے نہ کہ کسی خاص رقبہ زمین کے باشندہ ہونے کی۔ اس وجہ سے وہ اس کے عقلی و اخلاقی مطالبات اور تقاضوں کو دوسرے تمام مطالبات اور علایق پر مقدم رکھتا ہے۔ اگر کسی مرحلے میں عقل اور اخلاق کے مطالبات اور وطن کے مطالبات میں تصادم واقع ہو جائے تو اسلام کی ہدایت یہ ہے کہ آدمی عقل و اخلاق کے مطالبات کا ساتھ دے، وطن کے مطالبات کو نظر انداز کر دے۔ اگر ایک سرزمین پر آدمی اپنے اخلاقی و ایمانی تقاضوں کو پورا نہ کر سکتا ہو بلکہ وہ مجبور ہوتا ہو کہ وہ جس نظریہ حیات پر ایمان رکھتا ہے اس سے دست بردار ہو، جن اخلاقی ضوابط کا پابند ہے ان کو نظر انداز کرے اور جن حدود کی نگہداشت وہ اپنے فرایض میں سمجھتا ہے ان کو توڑے تو اس سرزمین کے ساتھ محض اس وجہ سے اس کا بندھے رہنا کہ وہاں سے اس کو پیٹ پالنے کو روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا میسر ہے اس کی انسانیت کی توہین ہے۔ ایک سچا مسلمان ایسی حالت میں دو ہی راہیں اختیار کر سکتا ہے یا تو اس کی اصلاح کے لیے اپنا پورا زور لگائے اور اس کو اس قابل بنائے کہ اپنے دین و ایمان کے ساتھ وہاں زندگی بسر کر سکے اور اگر وہ یہ نہیں کر سکتا تو پھر دوسری راہ یہ ہے کہ وہ اپنے دین

ایمان کو لے کر وہاں سے کسی ایسی سرزمین کی طرف ہجرت کر جائے جہاں زندگی کے دوسرے عیش چاہے حاصل نہ ہوں لیکن دین و ایمان کی آزادی حاصل ہو۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو عجب نہیں کہ وہ ایک مخالف ماحول میں ایمان کی نعمت ہی سے محروم ہو جائے۔ قرآن مجید کی ایک آیت کا ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

"جن لوگوں کو فرشتے اس حال میں موت دیتے ہیں کہ وہ (دارالکفر میں پڑے رہنے کے سبب سے) اپنی جانوں پر ظلم کر رہے ہیں۔ فرشتے ان سے پوچھتے ہیں تم کس حال میں پڑے رہے؟ وہ کہتے ہیں ہم اپنے وطن میں بےبس اور مقہور تھے۔ فرشتے ان سے کہتے ہیں کیا خدا کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے۔ وہی لوگ ہیں کہ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور برا ٹھکانا ہے۔" (۹۷، نساء)

مذہب اسلام مذہب کو قومیت کی تشکیل میں سب سے زیادہ مؤثر اور سب سے زیادہ قوی عامل مانتا ہے لیکن اگر مذہب کی بنیاد شرک پر ہو یا قومی تعصبات کے تحت اس میں حق و انصاف کے فطری اصولوں کو بالکل مسخ کر دیا گیا ہو، یا وہ حقیقی فرائض اور واقعی حقوق کی تعلیم دینے کے بجائے صرف عوام کی خواہشوں کا ایک مجموعہ بن کے رہ گیا ہو تو ایسے مذہب کو اسلام نہ تو صحیح مذہب مانتا اور نہ اس طرح کے کسی مذہب پر قائم ہونے والی قومیت کو صحیح قومیت تسلیم کرتا ہے۔ اس طرح کے مذہب میں وہ سارے مفاسد موجود ہوتے ہیں جو نسل و نسب اور زبان اور رنگ سے بنی ہوئی قومیتوں کے اندر ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ دنیا کے مشرکانہ مذاہب کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایجاد ہی اس لیے کیے گئے ہیں کہ وہ اپنے پیرووں کے قومی تعصبات اور ان کی قومی امنگوں کو اشیر باد دیں۔ یہودی مذہب اگرچہ اپنی اصل کے لحاظ سے مشرکانہ مذہب نہیں ہے بلکہ ایک آسمانی مذہب ہے لیکن بنی اسرائیل نے، جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں، اس میں طرح طرح کی تحریفات کر کے اس کو ایک خدائی مذہب کے بجائے اس کو اپنا ایک قومی مذہب بنا ڈالا۔ مذاہب کے اندر یہ فساد پیدا ہو جانے کے سبب سے اسلام ان میں سے کسی کو بھی اس لائق نہیں سمجھتا کہ وہ ایک صحیح المزاج قومیت کی بنیاد بن سکے۔

(باقی)